ہندوستان میں جدید عربی زبان و ادب کا پہل کار:
علامہ شبلی نعمانی رحمۃ اللہ علیہ

ابو سفیان اصلاحی ٭

علامہ شبلی نعمانی رحمۃ اللہ علیہ (۱۸۵۷ء-۱۹۱۴ء) کی جامع الصفات اور مختلف الجہات شخصیت کا احاطہ اگر مشکل نہیں تو آسان بھی نہیں ہے۔ ان کی اس آفاقی شخصیت کی تعمیر و ترقی میں ان کے اساتذۂ کرام اور ذاتی مطالعے کے ساتھ سرسید اور علی گڑھ کا کردار بہت واضح رہا ہے۔ انھوں نے اردو، فارسی اور عربی تینوں زبانوں میں، اپنے افکار اور اپنی فتوحات کے ان مِٹ نقوش چھوڑے ہیں۔ جو اربابِ علم و فضل کے لیے راہ نما اصول ہیں۔ اردو زبان کو علم و تحقیق کی زبان بنانے اور اردو تنقید کے اصول و ضوابط کے تعین میں آپ کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔ فارسی شعرا کے مقام و مرتبے کی توضیح میں **شعر العجم** ایک عمدہ تحقیقی کاوش ہے۔ اسی طرح عربی زبان و ادب کے ارتقا میں آپ کی نگارشات عالیہ کبھی بھی طاق نسیاں کی نذر نہیں ہو سکتیں۔ ہندوستان میں جدید عربی زبان و ادب کے رواج دینے میں آپ کو اولیت حاصل ہے۔ وہ امت مسلمہ کو اس زبان سے اس لیے جوڑنا چاہتے تھے کہ اس کا سارا سرمایہ اسی زبان میں ہے، قرآن کریم اور سیرت پاک کے اسرار و رموز اسی زبان سے وابستہ ہیں، جس کے بغیر تراث اسلامی تک رسائی ناممکن ہے۔ اس لیے انھیں یہ فکر ہمیشہ دامن گیر رہی کہ امت کا رشتہ اس سے کم زور نہ پڑنے پائے۔ روم و مصر اور شام کے سفر کے بعد اس فکر میں مزید شدت آتی گئی اور یہاں تک کہہ گئے کہ اگر ہم نے جدید عربی زبان و ادب کی کروٹوں کو محسوس نہ کیا تو عربوں سے ہمارا رشتہ کٹ جائے گا، کیوں کہ جدید عربی زبان میں صنعت و حرفت کی ترقی کی وجہ سے تیزی سے تبدیلیاں رونما ہو رہی تھیں۔ نئی نئی اصطلاحات، نئے نئے الفاظ اور تراکیب و تعبیرات ڈھل رہی تھیں، اگر ہماری ان سے ناآشنائی رہی تو عربوں سے ہمارا دینی، ثقافتی اور لسانی رشتہ منقطع ہو جائے گا اور ملکی سطح پر تجارتی روابط بھی منقطع ہو جائیں گے۔ مولانا نے سفر نامہ روم و مصر و شام میں اس موضوع کو بڑے سلیقے سے پیش کیا ہے۔[1]

٭ پروفیسر، شعبۂ عربی، مسلم یونی ورسٹی، علی گڑھ۔ (asislahi@gmail.com)

۱- دیکھیے: شبلی نعمانی، سفر نامہ روم و مصر و شام (اعظم گڑھ: دار المصنفین، شبلی اکیڈمی)۔

مولانا شبلی نے ہندوستان میں جدید عربی زبان کے ارتقا کے لیے کئی پیش بندیاں کیں۔ ایک تو محمڈن اینگلو اورینٹل کالج میں "لجنة الأدب"[۲] کے نام سے ۱۸۹۴ء میں ایک عربی سوسائٹی قائم کی جو ہندوستان کی اوّلین عربی انجمن تھی۔ اس سے پہلے ہندوستان میں کہیں جدید عربی زبان وادب کی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ یہ آواز اس شخص کے ادارے سے بلند کی گئی جسے انگریزوں کا پٹھو کہا جاتا ہے اور مشرقی تہذیب وثقافت کا دشمن بتایا جارہاہے، جب کہ سرسید کی تحریروں میں یہ شہادت موجود ہے کہ انھوں نے ہمیشہ عربی اور فارسی زبان کو اولیت دی اور اپنے ادارے میں تمام طلبہ کے لیے لازم قرار دیا کہ ان دونوں زبانوں میں سے ایک کا پڑھنا ضروری ہے اور یہ وضاحت بھی مناسب ہوگی کہ محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کے اولین شعبوں میں عربی اور فارسی کے شعبے بھی شامل ہیں۔ "لجنة الأدب" ایک ایسی ادبی ولسانی انجمن تھی جس میں صرف عربی زبان کا گزر تھا، اس کی تمام کارروائیاں عربی میں ہوتیں، یہی اس کی پہچان اور اساسی شناخت تھی۔ مقالات، تقاریر اور قصائد عربی زبان میں ہوتے۔ نذیر احمد، مولانا الطاف حسین حالی، مولوی داؤد اور مولانا حمید الدین فراہی وغیرہ اپنی نگارشات اور شاعری وغیرہ اسی انجمن کے زیر سایہ پیش کرتے۔ علامہ شبلی نعمانی کو جب شمس العلماء کا خطاب ملا تھا تو اس انجمن کی طرف سے ایک تہنیتی تقریب کا اہتمام کیا گیا تھا، جس میں کئی تقاریر اور تہنیتی قصائد ان کے اعزاز میں پیش کیے گئے تھے۔

آپ کے سفر روم ومصر وشام کا ایک نتیجہ یہ تھا کہ وہاں سے بے شمار جرائد ورسائل ہندوستان آنے لگے۔ ان رسائل کی وجہ سے ہندوستانی علماے کرام اور طلبۂ مدارس میں ایک علمی بیداری اور لسانی تحریک پیدا ہوئی۔ ان مصری جرائد ورسائل کے مقالات اردو میں منتقل کیے جانے لگے جس کی وجہ سے اردو زبان، نئے نئے افکار وخیالات سے آباد ہونے لگی۔ وہاں کی شخصیات اور ان کی علمی خدمات کو بھی اردو زبان کا حصہ بنایا گیا۔ آپ کے تلامذہ نے اس میں خوب بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ اس تعلق سے **الہلال** اور **الندوۃ** کی خدمات قابل ذکر ہیں۔ **الہلال** میں مصری اہل قلم کی بے شمار تحریریں پیش کی جاتیں، بلکہ یہ کہنا مناسب ہوگا کہ **الہلال** نے ہندوستان میں جدید عربی زبان وادب کے تعارف میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ شام ومصر سے آنے والی مطبوعات کا اس میں تعارف پیش کیا جاتا۔ آپ کی جن ارباب فکر ونظر نے اتباع کی ہے ان میں ایک نمایاں نام مولانا ابوالکلام آزاد کا ہے۔ انھوں نے مولانا کی فکری اور صحافتی تربیت پر خصوصی توجہ مبذول کی، کیوں کہ انھیں مولانا کی عبقریت کا اندازہ تھا

۲۔ ابوسفیان اصلاحی، "علامہ شبلی اور عربی زبان وادب" **فکر ونظر**، شبلی نمبر، علی گڑھ (جون ۱۹۹۶ء)، ۲۸۴-۲۸۵۔

جس کا اظہار انھوں نے مولانا فراہی سے بھی کیا تھا کہ یہ (مولانا آزاد) تم سے زیادہ ذہین ہیں۔ ہندوستانی مفسرین میں دو نام ایسے ہیں جن کے ہاں تفکر قرآن کا نیا انداز پایا جاتا ہے۔ مولانا حمید الدین فراہی کی **نظام القرآن** اور مولانا آزاد کی **ترجمان القرآن** میں کچھ نئی چیزیں ملتی ہیں ورنہ بقیہ اردو تفاسیر میں بالعموم دیگر عربی تفاسیر کی چیزوں کو جمع کر دیا گیا ہے۔ مجلہ **الندوۃ** کی ادارت میں مولانا کو اس لیے رکھا گیا تھا کہ ان کی صحافتی لیاقت کو ایک جہت مستقیم دی جاسکے۔ بہ ہر حال آپ کی کوششوں سے اس جوہر خالص کی چمک کو ہندوستان میں محسوس کیا گیا۔ آپ کو احساس تھا کہ عربوں سے ہمارا رشتہ منقطع نہ ہونے پائے، اسی لیے ان کے اس احساس کے تحفظ کے لیے مولانا کی جولانیاں **الہلال** میں نمایاں ہوئیں اور اس احساس کے استحکام کے لیے مزید معروف مجلے **ثقافۃ الھند** کا اجرا کیا۔ یہ رسالہ ہندوستان اور عرب دنیا کے مابین پل کی مانند ہے جس کے توسط سے ہندوستانی ثقافت عربوں کے سامنے پیش کی گئی، نیز ہندو عرب کے قدیم تجارتی و ثقافتی تعلقات پر روشنی ڈالی گئی۔

بالعموم یہ بات کہی جاتی ہے کہ ہندوستان میں جدید عربی زبان و ادب کا بانی ندوۃ العلماء ہے جب کہ حقیقت میں ادارۂ سر سید ہے اور اسے جدید عربی زبان و ادب کا مرکز بنانے میں علامہ شبلی کی کوشش کا دخل ہے۔ ادارۂ سر سید کے بعد جدید عربی زبان و ادب کو بلندیوں پر پہنچانے کا سہرہ ندوۃ العلماء ہی کے سر ہے۔ یہ ایک طویل موضوع ہے، لیکن اس کی تفصیل میں نہ جاتے ہوئے یہ بتانا ضروری ہے کہ انھوں نے مولانا عبد الحی لکھنوی کو بھی یہ تحریر کیا کہ طلبہ کو اس طرح سے تربیت دی جائے کہ وہ عربی میں اپنے مافی الضمیر کی نمائندگی کر سکیں۔ یہی وجہ ہے کہ ندوہ میں سید رشید رضا مصری کی آمد پر سید سلیمان ندوی نے عربی زبان میں ایسی شعلہ بیانی کا ثبوت دیا تھا کہ رشید رضا مصری بھی "قد أحسنت قد أحسنت" بول پڑے۔ شبلی ہی کی تربیت کا نتیجہ تھا کہ سید صاحب عربی تقریر اور تحریر دونوں پر قادر تھے۔ چناں چہ مولانا حمید الدین فراہی کے انتقال پر آپ نے عربی زبان میں ایک تحریر رقم کی جو **الإمعان في أقسام القرآن** کی ایک ابتدائی اشاعت میں شامل ہوئی تھی۔[۳] یہ ایک قابل دید تحریر ہے جس میں فصیح زبان کے زبردست بہاؤ کے ساتھ ساتھ ان شخصیات کے باہمی تعلق کی نوعیت کو بھی دیکھا جاسکتا ہے۔ علامہ نے اپنے دو شاگردوں مولانا فراہی اور سید سلیمان ندوی کے ذریعے عربی زبان و ادب میں ایک انقلاب

۳۔ دیکھیے: حمید الدین فراہی، **الإمعان في أقسام القرآن** (قاہرہ: المطبعة السلفية، ۱۹۳۰ء)۔

برپا کیا۔ (۴) مولانا فراہی نے تفسیر قرآن، استشہاد بکلام العرب، تحقیق مفردات اور بلاغت میں نہ جانے کتنے سنگ ہائے میل قائم کیے۔ یہی وجہ ہے کہ علامہ نے مولانا فراہی کو برادری کا تاج قرار دیا۔ (۵) **سیرت النبی** اور **شعر العجم** کی مختلف بحثوں میں علامہ نے اپنے شاگرد سے استفادہ کیا۔ جس کی شہادت **مکاتیب شبلی** میں دیکھی جا سکتی ہے۔ سیرت کے یہ مباحث قرآنیات اور عربی زبان و ادب کے پہلو سے بھی معرکہ آرا ہیں۔ علامہ کی خواہش تھی کہ ان کے شاگرد کو دنیا جانے، لیکن مولانا کو دنیاوی عزت و شہرت سے بے زاری تھی۔ علامہ نے اپنے خطوط اور اپنے مقالات میں جگہ جگہ شاگرد کی عبقریت کا اعتراف کیا۔ اسی تناظر میں تفسیر **نظام القرآن** اور **جمهرة البلاغة** کی خصوصیات پر اظہار خیال کیا۔

جمهرة البلاغة کے دو بنیادی نکات ہیں: ایک تو ارسطو کے بلاغی نظریات کو شواہد کی روشنی میں کالعدم قرار دیا گیا۔ ارسطو نے محاکات پر روشنی ڈالتے ہوئے بتایا تھا کہ واقعے کی اس طرح تصویر کشی کی جائے کہ وہ نظروں میں گھومنے لگے۔ مولانا کا خیال ہے کہ ارسطو کی محاکات فرضی لفظوں پر مبنی ہے، کیوں کہ اس کا خیال ہے کہ واقعے کو لطف اندوز بنانے کے لیے صداقت کو توڑا موڑا بھی جا سکتا ہے، یعنی واقعے کو گھٹانا اور بڑھانا دونوں کی گنجائش ہے تاکہ قارئین کی دل چسپی میں اضافہ کیا جا سکے۔ ارسطو کے خیال میں شاعری لطف انگیزی کا نام ہے، بلاغت ایک ایسی مصوری ہے جس میں کذب بیانی، سخن سازی اور مبالغہ آمیزی کا جواز ہے۔ یونانی شاعری صرف مذاقیہ جلسوں کو گرم کرنے کے لیے کی جاتی رہی۔ مولانا نے لکھا ہے کہ یونانی شعرا کی شاعری سے اس کی واقفیت بالکل نہ تھی۔ ہومر، سوفاکلیس اور دیگر یونانی شعرا کی شاعری کو سامنے رکھتے ہوئے اس نے اصول بلاغت کو ترتیب دیا۔ سوفاکلیس کا خیال ہے کہ ”میں نے اس کا حلیہ ویسا بیان کیا جیسا ہونا چاہیے نہ کہ ویسا جس طرح کہ حقیقتاً ہے۔“ عربوں کی بلاغت کا سارا انحصار بلاغت ارسطو پر تھا۔ جس کی وجہ سے انھیں کہنا پڑا ”أحسن الشعراء أكذبه“ یعنی سب سے حسین شعر سب سے جھوٹا ہے۔ مولانا نے ارسطو کے بلاغی نظریات کی تردید کے بعد قرآنی بلاغت کا تصور پیش کرتے ہوئے بتایا کہ اس بلاغت کا تمام دار و مدار صداقت پر ہے۔ قرآن کریم دنیا کی سب سے عظیم ادبی کتاب ہے جس کے متعلق ارشاد ربانی ہے: ﴿ قُل لَّئِنِ ٱجْتَمَعَتِ ٱلْإِنسُ وَٱلْجِنُّ عَلَىٰٓ أَن يَأْتُوا۟ بِمِثْلِ هَـٰذَا ٱلْقُرْءَانِ

۴۔ وضاحت کے لیے دیکھیے: ابو سفیان اصلاحی، ”مولانا فراہی اور سید سلیمان ندوی“ **اساطین عربی زبان و ادب** (دہلی: ارورا پرنٹرز، ۲۰۰۳ء)، ۸۳-۱۱۴۔

۵۔ شبلی نعمانی، **مکاتیب شبلی**، ترتیب: مولانا مسعود علی ندوی (اعظم گڑھ: مطبع معارف، ۱۹۲۷ء)، ۲: ۱۶۔

لَا يَأْتُونَ بِمِثْلِهِ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيرًا ﴾[۶] (کہہ دیجیے کہ اگر تمام انسان اور کل جنات مل کر اس قرآن کے مثل لانا چاہیں تو ان سب سے اس کے مثل لانا ناممکن ہے؟ گو وہ (آپس میں) ایک دوسرے کے مدد گار بھی بن جائیں۔") اسی مثالی اور الہامی کتاب میں آں حضور ﷺ کو بلیغ کہا گیا ہے یعنی ہر بات کو اتنی صراحت اور خوش اسلوبی سے پیش کیا ہے کہ وہ باتیں ذہن نشین ہوتی گئیں اور دشمنان رسول کا دائرہ سمٹتا گیا۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب سے مطالبہ کیا کہ "فاصدع بما تؤمر" (جو احکامات تمھیں دیے جا رہے ہیں انھیں کھول کھول کر بیان کرو۔) اسی لیے قرآن کریم میں اس بلیغ عظیم کے پیغام کو "بلاغ مبین" سے تعبیر کیا گیا ہے۔[۷] مولانا نے ایک طرف جہاں مولانا فراہی کی بلاغی آرا کا تعارف کرایا ہے، وہیں خود بھی "فن بلاغت" کے عنوان سے ایک جامع مقالہ تحریر کیا ہے جس میں مسلمانوں کو فن بلاغت کا موجد قرار دیا گیا ہے۔

یہاں وضاحت ضروری ہے کہ عربی لٹریچر میں **جمهرة البلاغة** ایک منفرد شان کی کتاب ہے۔ اسی لیے مولانا ابو الحسن علی ندوی (۱۹۱۴ء–۱۹۹۹ء) کو کہنا پڑا کہ اس کتاب کو عربوں کے مابین عام کیا جائے تاکہ یہ بات واضح ہو سکے کہ مولانا نے کس طرح بلاغت عربیہ کو عربوں ہی کے ذوق اور قرآنی ذوق کی مدد سے سمجھا ہے اور اس کتاب میں کیا انفرادیت ہے۔ پروفیسر محمد راشد ندوی اور ڈاکٹر عبد الباری مرحوم نے اپنے مقالات میں **جمهرة البلاغة** کی اہمیت و افادیت پر روشنی ڈالی ہے۔[۸] ضرورت ہے کہ اسے اردو میں منتقل کیا جائے تاکہ اربابِ ذوق اس کے بلاغی نوادرات سے مستفیض ہو سکیں۔ یہاں یہ اشارہ بھی مناسب ہوگا کہ پروفیسر سلیمان بستانی (۱۸۵۶ء–۱۹۲۵ء) نے یونانی شاعر ہومر (Homer) کی الیڈ (Iliad) کو عربی میں منتقل کیا ہے۔[۹] علامہ نے اس سعی مشکور کو سراہا۔ بستانی نے دو سو صفحے کا عالمانہ پیش لفظ بھی اس پر رقم کیا ہے جس میں ہومر کی شخصیت اور شاعری پر ارتکاز

۶۔ القرآن ۱۷: ۸۸۔

۷۔ شبلی نعمانی، "نظم القرآن و جمهرة البلاغة"، **مقالات شبلی** (اعظم گڑھ: مطبع معارف، ۱۳۶۹ھ)، ۲: ۱۷–۲۳۔

۸۔ ان دونوں مضامین کے لیے دیکھیے: **علامہ حمید الدین فراہی، حیات و افکار** (اعظم گڑھ: دائرہ حمیدیہ مدرستہ الاصلاح سرائے میر، ۱۹۹۲ء)، ۵۳۳–۵۶۱۔

۹۔ ہومر یونانی ادب کی معروف شخصیت ہے، تاہم اس کے تاریخی وجود کے بارے میں آرا مختلف ہیں، نیز اس کے زمانے کا تعین بھی ایک مشکل معاملہ ہے۔ Iliad اور Odyssey، اس کی دو مشہور رزمیات ہیں جن کے بارے میں کہا گیا ہے کہ وہ آٹھویں صدی قبل دور مشترک (BCE) میں مکمل ہوئیں۔

ہے، نیز اس کی شاعری کا عربی شاعری سے موازنہ بھی کیا ہے۔ یہ تمام مباحث بستانی کی ادب دوستی اور سخن فہمی کی دلیل ہیں۔ ان دونوں مضامین کی روشنی میں کہا جاسکتا ہے کہ علامہ فصاحت و بلاغت کے رموز و اسرار سے بہ خوبی واقف تھے۔ یہاں ایک اقتباس نقل کیا جارہا ہے تا کہ بلاغت کا حقیقی مفہوم آشکار ہو سکے:

اس موقع پر پہنچ کر ایک عام غلطی کا رفع کر دینا بھی ضروری ہے، اکثر لوگ شعر اور نثر بلیغ کو ایک سمجھتے ہیں، چنانچہ قدماء میں ارسطو اور متاخرین میں جان مل کا یہی مذہب ہے۔ ارسطو کا خیال ہے کہ محاکات کے مختلف طریقے ہیں اور خود کلام جو محاکات کا ایک خاص طریقہ ہے اس میں محاکات کے تین ذریعہ پائے جاتے ہیں: وزن، الفاظ، نغمہ؛ یہ چیزیں تنہا اور کبھی مل کر واردات قلبی کی تصویر کھینچتی ہیں، یہی محاکات شعر ہیں۔ یہ محاکات کبھی صرف الفاظ کے ذریعہ سے ہوتی ہے جس طرح سقراط کا مکالمہ اور کبھی الفاظ اور نظم دونوں کے ذریعہ سے؛ وزن، شعر کے لیے کوئی ضروری چیز نہیں، لیکن عام لوگوں نے اس کو شاعری کا ضروری جز قرار دیا ہے۔

ارسطو کا خیال اس حد تک صحیح ہے کہ وزن پر شعر کا مدار نہیں لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ وزن شعر کے اجزاء میں داخل نہیں، وزن شعر کا جز ہے لیکن چوں کہ کل کے لیے محض ایک جز کافی نہیں ہوتا، اس لیے تنہا وزن سے شعر نہیں بن سکتا، لیکن ارسطو کی یہ غلطی ہے کہ وہ سقراط کے مکالمہ اور ہومر کے کلام دونوں کو شعر قرار دیتا ہے۔[10]

علامہ شبلی نعمانی کی عربی تصانیف میں **الانتقاد على تاريخ التمدن الإسلامي**، **الجزية**، **تاريخ بدء الإسلام**، **طبقات ابن سعد** اور **إسكات المتعدي على إنصاف المقتدي** شامل ہیں، لیکن یہاں صرف **الانتقاد** پر قدرے اظہار خیال کی سعی کی جائے گی۔ علامہ کی یہ کتاب دراصل مشہور عربی نثر نگار جرجی زیدان کی کتاب **تاريخ التمدن الإسلامي** کا جواب ہے۔ یہ کتاب پانچ جلدوں پر مشتمل ہے۔ **الانتقاد** اس کی پہلی جلد کا جواب ہے۔ زیدان کی یہ کتاب اتہامات و الزامات کا پلندہ ہے۔ اس میں قرآن کریم، سیرت پاک، خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم اور اموی و عباسی خلفا کی تصاویر بگاڑنے کی کوشش کی گئی ہے۔ عربوں کی تحقیر و تذلیل کی گئی ہے، اموی اور عباسی خلفا کے متعلق بتایا گیا کہ وہ دین اسلام کی توہین کرتے تھے۔ قرآن کریم اور حرمین کے تقدس کو تار تار کرنا ان کا شیوہ تھا۔ روایات کے باب میں جرجی زیدان کا یہ کہنا تھا کہ کذب و افترا پر مبنی ہیں، اس میں تحریفات کی گئی ہیں۔ اس طرح کے بہت سے بے بنیاد الزامات اسلام پر عائد کیے گئے ہیں۔ مولانا نے ان تمام الزامات کا مدلل جواب دیا ہے۔ عربوں میں کوئی ایسا عالم نہیں تھا جو الزامات کا عالمانہ جواب دیتا۔ اس جواب کی تسوید میں مولانا کی ایک آنکھ بھی ضائع ہو گئی۔ اس کی تمام تفاصیل مکاتیب میں موجود ہیں کہ علامہ کو کن کن

۱۰۔ شبلی، مقالات، ۲: ۲۶–۲۷۔

مصائب سے گزرنا پڑا۔ مولانا نے اسے اردو میں بھی منتقل کیا جو الندوہ میں شائع ہوا، لیکن اپنی عربی تحریر کے متعلق بتایا ہے کہ اصل زور اسی میں ہے۔ مولانا کی یہ تحریر مجلہ المنار میں شائع ہوئی تھی جسے مدیر مجلہ رشید رضا نے سراہا۔ اس کے عالمانہ و فاضلانہ انداز کا اعتراف کرتے ہوئے انھوں نے بتایا کہ اسلوب بیان کے اعتبار سے بھی یہ قابل ستائش ہے، عجمیت کے اثرات سے پاک ہے، لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ الانتقاد میں جگہ جگہ رشید رضا کی اصلاحات بھی رہیں لیکن اس کی علمی عظمت مسلم ہے۔ اس طرح کی علمی دست رس صرف علامہ ہی کے یہاں مل سکتی تھی۔ یہاں ایک اقتباس دیا جارہا ہے تا کہ اس کی علمی قدر و منزلت کا اندازہ لگایا جاسکے:

أما قول عبدالملک للقرآن "هذا فراق بيني وبينک" فحقيقته أن عبدالملک كان قبل الخلافة ناسكًا منقطعًا إلى العبادة لا يشتغل بشيء من الدنيا. قال نافع ما رأيت في المدينة أشد نسكا و عبادة من عبدالملک ولما سألوا ابن عمر إلى من نرجع في الفتوى بعدک قال: ولد للمروان. و كان يقول ابن الزناد: الفقهاء في المدينة سبعة أحدهم عبدالملک. وقال الإمام الشعبي ما جالست أحدا إلا وجدت عليه الفضل إلا عبدالملک بن مروان، ذكر كل هذه الأقوال العلامة السيوطي في **تاريخ الخلفاء**، فلما جاءته الخلافة وهو يقرأ القرآن تصور خطارة الأمر، وأن مثل هذا العب، لايمكن تحمله إلا المنقطع إليه فقال تحسرا: هذا آخر العهد بک، أي الآن لا يمكن الانقطاع إلى العبادة و قراءة القرآن كما كان دأبي أولاً، وليس هذا على سبيل الاستهانة بالدين مطلقًا، فإنا نرى اشتغال عبدالملک بالفرائض والسنن فيما بعد فهو يصوم ويصلي و يحج. قال اليعقوبي في **تاريخه** و أقام الحج للناس في ولايته سنة ۷۲ھ الحجاج بن يوسف و سنة۷۳ھ و سنة ۷٤ھ الحجاج أيضًا و سنة۷۵ھ عبدالملک بن مروان و سنة ۷٦ھ أبان بن عثمان بن عفان، و سنة۷۷ھ أبان أيضًا و سنة۷۸ھ و سنة۷۹ھ وسنة۸۰ھ أبان أيضًا و سنة۸۱ھ سليمان بن عبدالملک (وسرد باقي السنوات فتركناها) وعبدالملک هو الذي كسا الكعبة الديباج. فهل هذا صنيع من يريد الاستهانة بالحرم؟[۱۱]

قرآن کریم کے متعلق عبد الملک کا یہ اظہار خیال ہے کہ "میرے اور تمھارے درمیان یہ جدائی ہے" اس کی حقیقت یہ ہے کہ خلافت سے قبل عبد الملک انتہائی عبادت گزار اور درویش صفت شخص تھا۔ دنیاوی امور سے اسے کوئی دل چسپی

۱۱- شبلی نعمانی، "الانتقاد على تاريخ التمدن الإسلامي"، **مجلة الهند** (بولفور بنغال الغربية،الهند)، ۳: ۱-۴؛ ۵۵٦-۵۵۷۔

نہیں تھی۔ نافع کا کہنا ہے کہ مجھے مدینہ میں عبدالملک سے بڑا عبادت گزار اور درویش کوئی اور نظر نہیں آیا۔ جب ابن عمر سے دریافت کیا گیا کہ آپ کے بعد فتوے کے سلسلے میں ہم کس سے رجوع کریں تو انھوں نے جواب دیا: مروان کے فرزند سے۔ ابن الزناد کہا کرتے تھے کہ مدینہ میں فقہا سات ہیں، عبدالملک ان میں سے ایک ہے۔ امام شعبی کہتے ہیں کہ عبدالملک بن مروان کو چھوڑ کر میں جس کے پاس بیٹھا مجھے اپنا قد بڑا نظر آیا۔ علامہ سیوطی نے ان تمام اقوال کو اپنی کتاب تاریخ الخلفاء میں نقل کیا ہے۔ تلاوت قرآن کی حالت میں خلافت کا بار جب ان پر آن پڑا تو انھیں معاملے کی نزاکت کا احساس ہوا کہ اس طرح کے بوجھ کا متحمل وہی شخص ہو سکتا ہے جو اس میں پوری طرح منہمک ہو جائے۔ اس وقت حسرت ویاس کے عالم میں ان کی زبان سے یہ جملے ادا ہوئے کہ یہ تم سے آخری ملاقات ہے۔ یعنی اب سابقہ معمول کے مطابق عبادت اور تلاوت قرآن میں انہاک ممکن نہیں ہوگا۔ ان کا یہ قول دین کی حقارت کے پہلو سے ہرگز نہیں تھا۔ اس لیے کہ فرائض و سنن سے ان کی وابستگی بعد میں ہی قائم رہی۔ نماز روزہ اور حج کی ادائی جوں کی توں باقی رہی۔ یعقوبی نے اپنی تاریخ میں لکھا ہے کہ ان کی امارت میں ۷۲ھ، ۷۳ھ اور ۷۴ھ میں حجاج نے ۷۵ھ میں عبدالملک بن مروان نے ۷۶ھ، ۷۷ھ، ۷۸ھ، ۷۹ھ، ۸۰ھ میں ابان بن عثمان اور ۸۱ھ میں سلیمان بن عبدالملک نے حج کا اہتمام کیا۔ (یعقوبی نے بہ ترتیب تمام سالوں کا ذکر کیا ہے ہم اسے چھوڑتے ہیں۔) عبدالملک ہی وہ شخص ہے جس نے خانہ کعبہ کو ریشم کا غلاف پہنایا۔ کیا جو شخص حرم کی تحقیر کرنا چاہتا ہو وہ اس طرح کا کارنامہ انجام دے سکتا ہے۔

الجزیۃ بھی علامہ کا ایک گراں قدر رسالہ ہے۔ علامہ نے لفظ جزیہ پر روشنی ڈالتے ہوئے بتایا کہ یہ فارسی لفظ "گزیہ" کا معرب ہے۔ عام طور سے مستشرقین کا اسلام پر یہ اعتراض ہے کہ اسلامی ریاست میں ذمیین سے جزیہ جبراً وصول کیا جاتا ہے، جب کہ یہ ایک ٹیکس ہے جو ان کی جان اور مال کے تحفظ کے لیے لیا جاتا ہے۔ ذمیین کو ہر طرح کی آزادی ہوتی ہے، ثقافتی امور اور عبادات کی ادائی کے باب میں ان پر کوئی قدغن نہیں ہوتی ہے۔ وہ اپنے عبادت خانے بھی تعمیر کر سکتے ہیں۔ جزیہ کا مصارفِ عامہ میں استعمال ہوتا ہے، اسی طرح سے صدقات کا اصل مصرف معاشرتی امور ہیں جن سے ذمیین بھی فیض یاب ہوتے ہیں۔ بہرکیف مختلف دلائل وشواہد کی روشنی میں معاندین اسلام کے اعتراضات کو بے بنیاد قرار دیا گیا ہے۔ یہاں ایک اقتباس نقل کیا جا رہا ہے تاکہ علامہ کا طرز تحقیق منظر عام پر آسکے:

> آنحضرت ﷺ و خلفائے راشدین کے جو معاہدے تاریخوں میں منقول ہیں ان میں عموماً پایا جاتا ہے کہ جزیہ ان لوگوں کی محافظت کا معاوضہ تھا۔ خود رسول اللہ ﷺ نے والی ایلیہ کو جو فرمان جزیہ کا تحریر فرمایا، اس میں یہ الفاظ مندرج فرمائے: یحفظوا أو یمنعوا، یعنی ان لوگوں کی حفاظت کی جائے گی اور دشمنوں سے بچائے جائیں گے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے وفات کے قریب جو نہایت ضروری وصیتیں کیں ان میں ایک یہ بھی تھی کہ غیر مذہب والے جو ہماری رعایا ہیں، وہ خدا اور رسول کی ذمہ داری ہیں اور مسلمانوں کو ان کی طرف سے ان کی دشمنوں سے مقابلہ کرنا چاہیے، اس موقع

پر ہم بعض معاہدات اصلی الفاظ میں نقل کرتے ہیں جن میں نہایت صاف اور مصرح طور پر ثابت ہوتا ہے کہ جزیہ صرف حفاظت کا معاوضہ تھا اور غیر مذہب والے جو مسلمانوں کی رعایا تھے، یہی سمجھ کر یہ معاوضہ ادا کرتے تھے۔

"هذا كتاب من خالد بن الوليد لصلوبا ابن نسطونا و قومه أني عاهدتكم على الجزية و المنعة فلك الذمة و المنعة مامنعنا كم فلنا الجزية وإلا فلا، كتب سنة اثنتي عشرة في صفر." (یہ خالد بن ولید کی تحریر ہے، صلوبا بن نسطونا اور اس کی قوم کے لیے میں نے تم سے معاہدہ کیا۔ جزیہ اور محافظت پر پس تمھاری ذمے داری اور محافظت ہم پر ہے، جب تک ہم تمھاری محافظت کریں، ہم کو جزیہ کا حق ہے ورنہ نہیں، ۱۳ھ صفر میں لکھا گیا۔)[۱۲]

علامہ شبلی نعمانی کا ایک اہم عربی رسالہ **تاریخ بدء الإسلام** ہے۔ اس میں مختلف سیرتی مآخذ سے مدد لیتے ہوئے آں حضور ﷺ کی ولادت سے لے کر وفات تک کے واقعات جمع کیے گئے ہیں۔ یہ ابتدائی درجات کے طلبہ کے لیے انتہائی مفید ہے۔ اس کا اسلوب بیان اور طریقۂ پیش کش انتہائی مؤثر ہے۔ ایک خاص بات یہ ہے کہ اس میں جگہ جگہ آیات کریمہ ذکر کی گئی ہیں، جس کی وجہ سے اس کی افادیت میں مزید اضافہ ہوگیا ہے۔ اس کی افادیت کے نقطۂ نظر سے اسے مولانا حمید الدین فراہی نے فارسی میں منتقل کیا اور میمونہ سلطان نے اسے اردو جامہ پہنایا۔ یہ کتاب کالج کے کورس میں داخل بھی تھی، یہاں اس کا ایک اقتباس مع ترجمہ نقل کیا جارہا ہے تاکہ قارئین کو اس زبان اور مقصد و مطلب تک رسائی ہو سکے:

لما دعاهم رسول الله ﷺ إلى التوحيد والإسلام وأنكر عليهم عبادة الأصنام، أخذتهم العزة بالإثم فأعرضوا واستهزءوا وأكثروا من الجدل و اللجاج وتشبثوا بحجج واهية وشبهات ساقطة، فمنهم من يقول "أجعل الإلهة إلها واحدًا" ومنهم من تمسك بالتقليد الجامد فقال "ما سمعنا بهذا في آبائنا الأولين بل نتبع ما ألفينا عليه آبائنا فلما أحس منهم الكفر أثبت عليهم حجة الحق باستدلالات لطيفة سهل المأخذ سمع التعاطي لاتبعد عن محجتهم ولا تخرج عن نطاق دركهم، فاستدل على وجود الخالق بشواهد الفطرة و عجائب آثارها.[۱۳]

۱۲- شبلی نعمانی، **مقالات شبلی**، ترتیب: مولانا مسعود علی ندوی (اعظم گڑھ: مطبع معارف، ۱۳۸۳ھ / ۱۹۵۴ء)، ۱: ۲۲۶۔

۱۳- شبلی نعمانی، "تاريخ بدء الإسلام"، **مجلة الهند** (بولفور بنغال الغربية، الهند)، ۱: ۳-۴، ۵۰۲-۵۰۳۔

اللہ کے رسول ﷺ نے جب انھیں توحید اور اسلام کی دعوت دی اور بت پرستی کی نکیر فرمائی تو گھمنڈ نے انھیں گناہ پر آمادہ کیا۔ انھوں نے اعراض و استہزا کی روش اختیار کی۔ مخاصمت اور دشمنی کی انتہا کر دی۔ کم زور دلائل اور بے بنیاد شبہات کا سہارا لیا۔ بعض نے کہا "کیا اس نے سارے معبودوں کو ایک الہ قرار دیا ہے" کچھ نے تقلید جامد کی روش اختیار کی اور کہا: "ہم نے اپنے آباواجداد میں اس طرح کی کوئی بات نہیں سنی ہم تو اس چیز کی اتباع کریں گے جس پر ہم نے اپنے آباواجداد کو پایا ہے۔ جب ان کے انکار و روگردانی کی روش بالکل واضح ہو گی تو آپ ﷺ نے ایسے سادہ، عام فہم اور لطیف استدلالات کے ذریعے ان پر حق کی حجت قائم کر دی جو ان کے عقل و فہم کے لیے نارسا نہیں تھی۔ چناں چہ فطرت اور اس کے عجیب و غریب آثار کو خالق کے وجود پر بہ طور دلیل کے پیش فرمایا۔

علامہ کا ایک رسالہ **إسكات المعتدي على إنصات المقتدي** ہے۔ یہ کانپور کے مطبع نظامی سے محرم ۱۳۹۸ء / دسمبر ۱۸۸۰ء میں شائع ہوا۔ اس کا شمار علامہ کی ابتدائی تحریروں میں ہوتا ہے۔ جس وقت وہ حنفیت کے پرجوش حامی تھے۔ یہ رسالہ تائید حنفیت میں ترتیب دیا گیا ہے۔ ایک طرح سے علامہ نے دیگر ائمہ کے مقابلے میں امام اعظم کو اولیت دینے کی کوشش کی ہے۔ علامہ کے ذہن پر امام اعظم کی وہ قدر و منزلت طاری تھی کہ انھوں نے **سیرۃ النعمان** لکھ کر امام اعظم کی فقہی اور علمی خدمات کا مدلل اعتراف کیا ہے۔ یہ کتاب امام اعظم پر ترتیب دی جانے والی تصانیف میں نمایاں حیثیت کی حامل ہے۔ بہرکیف موضع بحث میں امام اعظم کے خیال کے مطابق امام کے پیچھے جہری اور سری دونوں نمازوں میں مقتدی کو خاموش رہنا ہے۔ اس کتاب میں اسی نقطۂ نظر کی قرآن کریم، احادیث اور دیگر فقہا کی آرا سے تائید کی گئی ہے۔ یہاں ایک اقتباس کو مع ترجمہ نقل کیا جائے گا تاکہ علامہ کی عربی نگارشات اور مذکورہ نقطۂ نظر دونوں کا اندازہ ہوسکے۔

أما المقصود فهو أنه لا يقرأ المؤتم خلف الإمام لا في الجهرية ولا في السرية، والحجة على ذلك الآية الكريمة (وإذا قري القرآن فاستمعوا له وأنصتوا) فإن المطلوب أمران: الاستماع والإنصاف فيعمل بكل منهما، والأول يخص بالجهرية والثاني لا فيجري على إطلاقه، فيجب السكوت عندالقراءة مطلقًا كذا في فتح القدير. والمنكرون قد بذلوا سعيهم في هدم بناء الاحتجاج، وإني أذكر ما عرض لهم ثم أبطله بمايكون مسكتا لكل من خاصم وحاج ويظهرلك أن هذا عذب فرات وهذا ملح أجاج، فنقول إنهم تفرقوا في وجه الاعتراض شيعا فمنهم من أثبت نزول الآية في الخطبة ومنهم من اختار ورودها في كلامهم في الصلوة مع أن سعيهم لايكاد يرجع إلى طائل فإن العبرة لعموم اللفظ لا لخصوص المعنى، وهذا على سبيل التنزل وإلافقد اتفق العلماء ومن يعتدبه منهم على أن الآية وردت في الصلوة كما نقله البيهقي، ويؤيدك ما

وردت به الأخبار قال علي بن طلحة عن ابن عباس قوله"وإذا قرئ القرآن" يعني في الصلوٰة المفروضة، رواه عماد بن كثير في تفسيره وأخرج عبد بن حميد والبيهقي في القراءة عن أبي العالية أن النبي ﷺ كان إذا صلى بأصحابه فقرأ أصحابه فنزلت هذه الآية فسكت القوم.[۱۴]

مقصود و مطلوب یہ ہے کہ مقتدی امام کے پیچھے کسی بھی صورت میں قراءت نہیں کرے گا خواہ جہری نماز ہو یا سری۔ اس کی دلیل آیت کریمہ "جب قرآن پڑھا جائے تو غور سے سنو اور خاموش رہو" ہے۔ آیت کریمہ سے دو چیزیں مطلوب ہیں؛ بہ غور سماعت اور سکوت؛ لہٰذا ان دونوں میں سے ہر ایک پر عمل کیا جائے گا اور استماع جہری نماز کے ساتھ مخصوص ہے نہ کہ سری نماز کے ساتھ، اس لیے وہ اپنے عموم پر باقی رہے گا اور قراءت کے وقت مطلقاً سکوت واجب ہو گا جیسا کہ فتح القدیر میں ہے۔ منکرین نے حجت کی اساس منہدم کرنے کی پوری کوشش کی ہے۔ میں ان کے اعتراضات کو پیش کر کے فریق مخالف کے ہر فرد کی رائے کا مسکت انداز میں ابطال کروں گا جس سے واضح ہو جائے گا کہ ایک طرف چشمۂ شیریں ہے اور دوسری طرف نہایت شور و تلخ۔ اعتراض کی رو سے ان کے کئی گروپ ہیں۔ بعض کے نزدیک آیت کا نزول خطبے کے سلسلے میں ہے۔ بعض اسے نماز میں گفت گو سے متعلق قرار دیتے ہیں، حالاں کہ ان کی اس کوشش کا کوئی فائدہ نہیں ہے، اس لیے کہ اعتبار عموم لفظ کا ہو گا نہ کہ کسی خاص معنی کا اور یہ بہ منزلہ انحراف ہے، ورنہ علما کی ایک معتدبہ تعداد کا اس بات پر اتفاق ہے کہ آیت کا نزول نماز سے متعلق ہے اور اس سلسلے میں وارد شدہ اخبار سے بھی اس کی توثیق ہوتی ہے۔ علی بن طلحہ ابن عباس کا یہ قول نقل کرتے ہیں کہ "إذا قرئ القرآن"، یعنی فرض نماز میں جب (جب قرآن پڑھا جائے)۔ عماد بن کثیر نے اپنی تفسیر میں اس کو بیان کیا ہے اور عبد بن حمید اور بیہقی نے ابو العالیہ سے مروی قراءت میں اس کی تخریج کی ہے کہ آپ ﷺ جب اپنے اصحاب کو نماز پڑھاتے تھے تو صحابہ کرام بھی قراءت کیا کرتے تھے، لیکن جب یہ آیت نازل ہوئی تو صحابہ خاموش رہنے لگے۔

علامہ شبلی نعمانی کی علمی خدمات سے واضح ہے کہ وہ تین زبانوں عربی، فارسی اور اردو سے نہ صرف واقف تھے بلکہ تینوں کے مصادر و مراجع آپ کی نظر میں تھے۔ ان کے محاسن اور معائب پر آپ کی نظر تھی۔ شعر العجم اور فارسی کلیات سے آپ کی فارسی دانی کا اندازہ لگانا دشوار نہیں ہے۔ اسی طرح آپ کی تصانیف، مقالات اور اردو کلیات کی روشنی میں آپ کو اردو ادب کے صف اول کے معماروں میں شمار کرنا درست ہو گا۔ اسی طرح آپ کی عربی تصانیف، عربی خطوط اور عربی شاعری آپ کی اعلیٰ عربیت پر دال ہیں۔ جس طرح آپ نے فارسی اور اردو تنقید کے اصول منضبط کیے، اسی طرح آپ کی خواہش تھی کہ عرب شعرا کے آثار و اقدار کو اس طرح قلم بند کیا

۱۴- شبلی نعمانی، "إسكات المعتدي على إنصات المقتدي"، مجلة الهند (بولفور بنغال الغربية،الهند)، ۳: ۱-۴، ۴۸۴-۴۸۵۔

جائے کہ وہ شعر العرب کی تاریخ بن جائے۔ علامہ نے **موازنہ انیس ودبیر** کے افتتاحی کلمات میں عربی اور فارسی کا اس طرح موازنہ کیا ہے کہ پوری شاعری میں اس کی مثال ملنی مشکل ہے کیوں کہ پوری عربی اور فاری شاعری پر آپ کو دست رس حاصل تھی۔ مولانا کا ایک عمدہ مقالہ "عربی اور فارسی شاعری کا موازنہ" ہے جس سے واضح ہوتا ہے کہ دونوں شاعری کی جزئیات اور لطائف پر علامہ کی گہری نظر تھی۔ یہاں ایک اقتباس سے آپ کی وسعتِ مطالعہ کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ علامہ عربوں کی شوریدہ سری اور ستیزہ کاری کا ذکر کرنے کے بعد رقم طراز ہیں:

ان باتوں کا یہ اثر تھا کہ ان کے اشعار میں شجاعت، جان بازی، مخاطرۂ نفس، اندھا دھند دلیری کے جو خیالات پائے جاتے ہیں، فارس بلکہ دنیا کی کسی قوم کو نصیب نہیں ہو سکتے، اس قسم کے اشعار کو حماسات کہتے ہیں۔ ان حماسیات کو پڑھو تو یہ عالم نظر آتا ہے کہ جنگل میں شیر گونج رہا ہے، فردوسی نے بھی **شاہنامہ** میں بڑے بڑے زور کے معرکے لکھے ہیں، لیکن وہ اور دن کے افسانے ہیں، فردوسی داستان گو بن کر ان کو بیان کرتا ہے لیکن عرب کا شاعر جو کہتا ہے، اپنی سرگذشت کہتا ہے اور اس لیے اس کا جو اثر ہے **شاہنامہ** کا نہیں ہو سکتا۔ عرب میں جو مشہور شاعر گزرے ہیں وہی مشہور بہادر اور جنگ آور تھے، مثلاً امراء القیس، عمرو بن کلثوم، عمرو معدی کرب، اس لیے وہ زبان سے وہی کہتے تھے جو ہاتھ سے کرتے تھے۔ اس کے مقابلہ میں عجم کے شعراء کی یہ حالت تھی کہ انوری ایک دفعہ ڈاکوؤں میں گھر گیا۔ ایک حکیم صاحب اور ایک درزی بھی ساتھ تھا، سب جان بچا کر بھاگ نکلے، انوری بطور علوم متعارفہ کے کہتا ہے:

حکیم و شاعر و درزی چگونہ جنگ کنند[(۱۵)]

علامہ نے شعر العرب کے آغاز میں ان مؤرخین کا بھی ذکر کیا ہے جنھوں نے عربی شاعری کے آغاز اور شعرا کی خصوصیات پر اپنے خیالات کو قلم بند کیا ہے۔ ابن رشیق کی کتاب **العمدة** کی ادبی و انتقادی خدمات کا

۱۵۔ شبلی، مقالات، ۲: ۴۹–۵۰؛ یہ ایک مزاحیہ قطعے کا جز ہے جو مکمل یوں ہے:

من و سہ شاعر و شش درزی و چہار دبیر
اسیر و خوار بماندیم در کف دو سوار
دبیر و درزی و شاعر چگونہ جنگ کنند
اگر چہاردہ باشند ور چہار ہزار

(میں، تین شاعر، چھے درزی اور چار ادیب صرف دو سواروں کے ہاتھوں پٹ گئے۔ مصنف، درزی اور شاعر کس طرح لڑ سکتے ہیں خواہ وہ چودہ ہوں یا چار ہزار۔)

قدیم نسخوں میں 'حکیم' کا لفظ ملتا ہے۔

جائزہ بھی لیا ہے۔ مولانا کی یہ کدوکاوش اگر پایۂ اختتام کو پہنچ جاتی تو ایک عظیم ملی وادبی خدمت منظر عام پر آجاتی۔ آپ کے انتقال کے بعد شعر الہند اور اقبال کامل کے مصنف اور علامہ کے شاگرد مولانا عبد السلام ندوی نے شعر العرب کا بیڑا اٹھایا، لیکن افسوس کہ مولانا بھی اسے تشنۂ تکمیل چھوڑ کر اپنے آخری سفر پر روانہ ہو گئے۔ کیا ہی مناسب ہوتا کہ دار المصنّفین اس ادھورے کام کی تکمیل کرتا، لیکن افسوس کہ طباعت کا کام تو وہاں ہو رہا ہے لیکن تحقیق و تصنیف کا سلسلہ موقوف ہو چلا ہے۔ یہاں شعر العرب کی ایک تصویر پیش کی جارہی ہے تاکہ علامہ کی آفاقیت اور ابعاد ادبیت کا اندازہ ہو سکے۔ مندرجہ ذیل سطور سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ علامہ عربی شاعری کے مزاج اور جہتوں سے بہ خوبی واقف تھے:

عرب کا ملک ہزاروں برس سے موجود ہے، اس کا تمدن بھی کچھ نو عمر نہیں، تاہم تعجب ہے کہ شاعری کا پتہ اسلام سے سو ڈیڑھ برس آگے نہیں چلتا۔ سب سے پہلا شاعر جس سے قصیدہ کی ابتدا ہوئی، مہلہل بن ربیعہ ہے جو امراء القیس کا ماموں تھا۔ فرزدق کہتا ہے: "ومهلهل الشعراء ذاك الأول."

امراء القیس آں حضرت ﷺ سے تقریباً ۴۰ برس پہلے تھا، اس لیے مہلہل کا زمانہ بھی اس کے قریب قریب سمجھ لینا چاہیے۔ یہ بات عرب کی تاریخ کا طغرائے زریں ہے کہ وہاں شاعری کی ابتدا شریفانہ اور مردانہ جذبات سے ہوئی۔ ایران کی طرح مداحی اور خوشامد گوئی میں اس کی زبان نہیں کھلی۔ عرب ہمیشہ سے جنگ جو، بہادر، مہمان نواز، سیر چشم، غیور اور بلند ہمت تھے، انھی باتوں کو نظم میں ادا کرتے تھے اور یہی ان کی شاعری تھی۔ کوئی قبیلہ کسی شاعر کی خانہ جنگیوں میں کسی قسم کی مدد کرتا تھا تو شکریہ کے ساتھ اس کا ذکر کرتے تھے۔ مثلاً امراء القیس نے بنو تمیم کی مدح میں کہا:[۱۶]

أقر حشا امرء القيس بن حجر
بنو تيم مصابيح الظلام[۱۷]

علامہ نے اپنے مقالات میں عربی ادب کی نام ور شخصیت محمد فرید وجدی کی علمی حیثیت کی تعیین میں ایک مختصر تحریر ترتیب دی ہے جس میں فرید وجدی کو ایک معمولی محقق اور مصنف کی صورت میں پیش کیا گیا ہے۔ اس تحریر سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے فرید وجدی کی تمام تصانیف کا مطالعہ نہیں کیا ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو یہ منفی نقطۂ نظر ان کے باب میں نہ قائم کرتے۔ فرید وجدی کا نام جدید عربی ادب کے ان محققین میں شمار ہوتا ہے جنھوں نے اسلام کا فلسفیانہ مطالعہ کیا تھا۔ وہ ایک فلسفی تھے، دین اسلام کی فلسفیانہ اقدار سے بہ خوبی واقف

۱۶- شبلی، نفس مصدر، ۲: ۳۰-۳۱۔

۱۷- امری القیس، ديوان إمرئ القيس، مرتبہ: محمد ابو الفضل ابراہیم (مصر: دار المعارف، ۱۹۵۸ء)، ۱۴۱۔

تھے۔ استشراق کی دسیسہ کاریاں اور فریب کاریاں ان کی نظر میں تھیں، ان کی تصانیف میں ان کا جواب بھی دیا گیا ہے۔ مولانا آزاد فرید وجدی کے کمالات اور عالمانہ تحلیل و تجزیے سے باخبر تھے، اسی لیے انھوں نے ان کی کتاب **المرأة المسلمة** کا اردو میں ترجمہ کیا ہے۔ خاکسار نے فرید وجدی کی حکمت و بصیرت کو منظر عام پر لانے کے لیے ایک تحقیقی مقالہ "فرید وجدی کا جدید عربی ادب میں حصہ"[۱۸] تحریر کروایا، نیز ارباب اردو زبان وادب کے سامنے ان کی مایۂ ناز شخصیت کے تعارف کے لیے ماہ نامہ **معارف** میں دو قسطوں میں ایک مقالہ "فرید وجدی اور ان کے افکار" کے عنون سے تحریر کیا۔ اس مضمون میں علامہ شبلی کے منفی خیال کا جواب تحریر کیا گیا ہے۔[۱۹] یہ سچ ہے کہ جدید عربی ادب کی شخصیات میں انھیں مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ علامہ نے اپنے سفر نامے میں علی پاشا مبارک (۱۸۲۴ء–۱۸۹۲ء)، علی پاشا ابراہیم (۱۸۸۰ء–۱۹۴۷ء) اور امین بکری پر بھی اظہار خیال کیا ہے۔ علامہ نے حسان الہند مولانا غلام علی آزاد بلگرامی کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے بتایا کہ تذکرہ نویسی میں انھیں ممتاز مقام و مرتبہ حاصل ہے، لیکن عربی اور نعتیہ شاعری کے حوالے سے انھوں نے مولانا بلگرامی کو ایک معمولی درجے کا شاعر قرار دیا ہے۔ گویا علامہ کے نزدیک وہ ایک تک بند شاعر تھے، زبان و بیان کے اعتبار سے ابداع و ابتکار کا فقدان ہے اور ان کی قوت انتقاد انھیں "اچھا شاعر" قرار دینے سے قاصر ہے۔ وہ ایک غیر معمولی عاشق رسول تو ہیں لیکن قابل ذکر شاعر ہرگز نہیں۔ علامہ کا یہ مختصر ترین مضمون ہے لیکن اس کے باوجود مولانا بلگرامی کا پورا شعری قد سامنے آجاتا ہے۔ مناسب ہوگا کہ علامہ کے الفاظ ملاحظہ کر لیے جائیں:

> آزاد کا عربی اور فارسی کلام اگرچہ کثرت سے ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان کے چہرۂ کمال کا داغ ہے اس سے انکار نہیں ہوسکتا کہ وہ عربی زبان کے بہت بڑے ادیب ہیں، نہایت نادر کتب ادبیہ پر ان کی نظر ہے۔ لغات، اور محاورات ان کی زبان پر ہیں، کلام میں اس قدر عجمیت ہے کہ اس کو عربی کہنا مشکل ہے۔ ان کو اس پر ناز ہے کہ انھوں نے عجم کے خیالات عربی زبان میں منتقل کیے ہیں، لیکن نکتہ سنج جانتے ہیں کہ یہ ہنر نہیں بلکہ عیب ہے۔ "خط نمودہ ام چشم آفریں دارم۔"[۲۰]

۱۸– ڈاکٹر جاوید خان نے یہ مقالہ خاکسار کی زیر نگرانی ترتیب دیا جس پر علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی نے انھیں ۲۰۰۴ء میں ڈاکٹریٹ کی سند تفویض کی۔

۱۹– وضاحت کے لیے دیکھیے: ابو سفیان اصلاحی، "محمد فرید وجدی اور ان کے افکار" **معارف**، اعظم گڑھ (۱۹۹۴ء) ۱۵۳: ۲، ۱۰۹–۱۲۵؛ (۱۹۹۴ء)، ۱۵۳: ۴، ۲۷۰–۲۸۵؛ علامہ کی تحریر کے لیے دیکھیے: شبلی، **مقالات شبلی** (اعظم گڑھ: مطبع معارف، ۱۹۵۵ء)، ۵: ۱۲۹–۱۳۱۔

۲۰– شبلی، **مقالات**، ۵: ۱۲۲۔

یہ بات بھی روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ بلاد عربیہ کے محققین، ادبا، شعرا اور قلم کار حضرات بہ خوبی علامہ کی تحقیقی اور تصنیفی بلندیوں سے واقف تھے۔ علامہ جب مصر پہنچے تو وہاں کے اہل علم نے آپ کی پذیرائی میں کسی کوتاہی کا ثبوت نہیں دیا۔ رسالہ البشیر میں پروفیسر انطون نے آپ کی بلندیوں اور علمی فراست کا ذکر کیا۔[۲۱] ازہری شیوخ سے نہ صرف ہم کلام ہوئے، بلکہ انھیں مرعوب بھی کیا، نیز بتایا کہ ازہری شیوخ قوم کے نونہالوں کو برباد کر رہے ہیں، ان کا سارا انحصار حواشی اور شروح پر ہے۔[۲۲] جامعہ ازہر تقلید کا مرکز ہے، تحقیق سے انھیں انقباض ہے۔ شیخ محمد عبدہ نے جامعہ ازہر کو تقلید جامد سے نکال کر راہ تحقیق پر ڈالا۔ ان کے شاگرد رشید رضا سے علامہ کے گہرے مراسم رہے۔ اسی بنیاد پر وہ ندوۃ العلماء آئے۔ ان کے مجلے **المنار** میں آپ کی تحریریں اور خطوط شائع ہوئے۔ انھی تعلقات کے نتیجے میں علامہ رشید رضا کی شناسائی مولانا فراہی کے علمی کام سے ہوئی اور انھوں نے مولانا فراہی کی تفسیر **نظام القرآن** کے بعض اجزا پر تبصرہ بھی کیا۔[۲۳] جس میں مولانا کے تفردات اور نظریۂ نظم قرآن کا خصوصیت سے ذکر کیا گیا۔ یہاں یہ تذکرہ ہرگز نامناسب نہ ہوگا کہ علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی، ندوۃ العلماء، دارالمصنّفین اور مدرسۃ الاصلاح نے عربی زبان و ادب کی ایک قابل قدر دنیا آباد کی ہے۔ علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کا شعبۂ عربی اس وقت نہ صرف ہندوستان بلکہ بیرون ہند بھی اپنی تحقیقی خدمات کی وجہ سے شہرت کی بلندیوں پر فائز ہے۔ یہاں کے یورپین اور ہندوستانی اساتذۂ کرام خصوصاً عبدالعزیز میمن اپنے تحقیقی نوادر کی وجہ سے دنیاے عربی میں انتہائی مقبول تھے۔[۲۴] ندوۃ العلماء اس وقت جدید عربی زبان و ادب کا منبع ہے۔ مولانا عبدالحی کی **نزهة الخواطر** اور **الثقافة الإسلامية في الهند** عالمی معیار کی کتابیں ہیں۔ مولانا ابوالحسن علی ندوی کی یگانۂ روزگار کتاب **ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمين** عربوں کے لیے باعث اشتیاق ہے۔ دارالمصنّفین سے **إمعان في**

۲۱۔ شبلی نعمانی، *سفر نامہ*، ۱۳۸۔

۲۲۔ وضاحت کے لیے دیکھیے: شبلی نعمانی، *نفس مصدر*، ۱۴۷–۱۷۵۔

۲۳۔ دیکھیے: رشید رضا "تقريظ المطبوعات الجديدة (نظام القرآن و تأويل الفرقان بالفرقان)"، **مجلة المنار** (مصر)، ۱۲: صفر ۱۳۲۷ھ، ۱۳۵۔

۲۴۔ وضاحت کے لیے دیکھیے: ابو سفیان اصلاحی، *علامہ عبدالعزیز میمنی، دراسة تحليلية* (علی گڑھ: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، ۲۰۱۳ء) ۵۰–۷۶؛ مزید وضاحت کے لیے دیکھیے: محمد راشد شیخ، *علامہ عبدالعزیز میمن، سوانح اور علمی خدمات* (کراچی: قرطاس، ۲۰۱۱ء)، ۶۳۲۔

اقسام القرآن اور **أبو العلاء المعري و ما إليه** کی اشاعت ہوئی۔ ان دونوں کتابوں نے دنیاے علم کو حیرت و استعجاب میں ڈال دیا۔ سید سلیمان ندوی کی تصانیف **عرب وہند کے تعلقات**، **عربوں کی جہاز رانی**، **دروس الأدب** اور **لغات جدیدہ** نے عربی زبان و ادب کے گوشوں کو شائقین ادب کے سامنے پیش کیا۔ مدرسۃ الاصلاح کے فضلا نے عربی زبان و ادب کے مختلف پہلوؤں کو موضوع بحث بنایا، بالخصوص مولانا محمد اجمل ایوب اصلاحی ندوی نے **مفردات القرآن** اور **الانتقاد علی تاریخ التمدن الإسلامي** کی تحقیق و تدوین سے دنیاے عربی میں اضافہ کیا ہے۔ پروفیسر محمد اسلم اصلاحی نے اپنی مختلف نگارشات سے عربی زبان و ادب میں قابل قدر اضافہ کیا ہے۔ مذکورہ سطور صرف اس لیے تحریر کی گئیں کہ ان تمام علمی اور تحقیقی فتوحات کے پیچھے علامہ شبلی نعمانی کی کاوشیں کار فرما ہیں۔ انھوں نے ان اداروں کو اپنے خون جگر سے سینچا اور اپنے تلامذہ کو علم و تحقیق کا شیدائی بنایا۔ یہی تو وجہ ہے کہ مولانا دریابادی نے انھیں مصنف اور مصنف گر کہا ہے۔[۲۵] مہدی افادی نے انھیں تاریخ کا معلم اوّل قرار دیا ہے[۲۶] اور سید سلیمان ندوی نے عہد جدید کا معلم اوّل بتایا ہے۔[۲۷] اس معلم اوّل کی عربی زبان و ادب میں فتوحات کا آغاز اس قصیدے سے ہوتا ہے جو انھوں نے سرسید کی جلالت شان کی تقدیم کے لیے منظوم کیا تھا۔ یہ صراحت لازمی ہے کہ علامہ شبلی کے سرسید سے پرانے گھریلو تعلقات تھے۔ ان کے والد محترم کے سرسید سے دیرینہ مراسم تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے بڑے بھائی مولوی اسحاق محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کے طالب علم تھے۔ چناں چہ علامہ کے والد محترم نے علی گڑھ کے سفر کا عزم کیا تاکہ بیٹے کی خبر لے سکیں نیز سرسید سے ملاقات بھی۔ موقع کو غنیمت جانتے ہوئے علامہ بھی اپنے والد محترم کے ساتھ ہو لیے تاکہ محسن ملت کا وہ قریب سے دیدار کر سکیں، کیوں کہ والد محترم سرسید ہی کے مہمان ہوتے تھے۔ علامہ یہ نہیں چاہتے کہ دست بستہ اپنے سیدی کے حضور

۲۵- عبد الماجد دریابادی، "شبلی انسان، مصنف، مصنف گر"، **معارف**، اعظم گڑھ (۱۹۶۵ء)، ۱۲۰-۱۲۲۔

۲۶- **افادات مہدی** میں ایک مضمون بعنوان "ملک میں تاریخ کا معلم اوّل یعنی شمس العلماء علامہ شبلی نعمانی" ہے جس میں مہدی افادی نے علامہ کی تاریخ نگاری پر اظہار خیال کیا ہے۔ (دیکھیے: ایم مہدی حسن، **افادیت مہدی**، مرتبہ: مہدی بیگم (معاد پریس، بدون تاریخ)، ۲۱۸-۲۲۸)۔

۲۷- سید سلیمان ندوی، **حیات شبلی** (اعظم گڑھ: دار المصنفین، اکتوبر ۲۰۰۸ء)، ۷۔

کھڑے ہو جائیں، بلکہ اپنا نذرانۂ عقیدت ان کی خدمت اقدس میں پیش کرنے کی ٹھانی اور عربی زبان میں ایک خوب صورت قصیدہ منظوم کیا۔(۲۸)

اس قصیدے میں سر سید کی خاندانی وجاہت کا ایک طرف ذکر ہے تو دوسری طرف ان کی علمی شان کا قصہ بھی چھیڑا گیا ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ ان کی معاشرتی اور تعلیمی تحریک کا ذکر بھی کیا گیا ہے۔ اس تناظر میں راقم الحروف یہ بھی کہنا چاہے گا کہ علی گڑھ کے تعارف اور اس کی تعریف میں علامہ کا قابل ذکر کردار رہا ہے جس کی شہادت ان کے مقالات، خطبات اور عربی و فارسی شاعری میں ملاحظہ کی جاسکتی ہے۔(۲۹) افسوس تو اس بات کا ہے کہ سید صاحب نے اپنے استاد محترم کے بہت سے ان قصائد کو فارسی کلیات میں جگہ نہ دی جو کالج میں معروف شخصیات کی آمد پر کہے جاتے تھے۔ ان قصائد کی خاص بات یہ ہے کہ ان میں سر سید کی اصلاحات اور ان کی تعلیمی سرگرمیوں کا ذکر کیا گیا ہے اور علی گڑھ تحریک کی نمائندگی کی گئی ہے۔ علامہ کے اس عربی قصیدے میں بھی سر سید کی تحریک کی افادیت پر آواز بلند کی گئی ہے۔ یہاں پورا قصیدہ بطور مسک الختام نقل کیا جارہا ہے۔

المجد یصحب علما حیثما یصل

والعلم عن قومنا لازال یرتحل

بزرگی جہاں جہاں جاتی ہے، علم کو بھی ساتھ لے جاتی ہے،

حالاں کہ علم ہماری قوم سے رخصت ہو رہا ہے۔

۲۸- ظفر الاسلام اصلاحی "مولانا شبلی نعمانی اور علی گڑھ"، **فکر و نظر**، (علی گڑھ)، ۱۹۹۶ء، ۲۵۲-۲۵۳۔

۲۹- پاکستان کے معروف ادارے مجلس برائے تحقیق اسلامی و ثقافت کراچی کے مجلہ **الایام** نے علامہ شبلی نعمانی پر ایک گوشہ شائع کیا ہے، جس میں راقم الحروف کے چار مقالات اس طرح ملاحظہ کیے جاسکتے ہیں: ۱- علامہ شبلی نعمانی اور عربی زبان و ادب، ۲- مکاتیب شبلی میں عربی زبان و ادب، ۳- تاریخ ترتیب قرآنی از علامہ شبلی نعمانی: ایک جائزہ، ۴- مکاتیب شبلی، بنام حبیب الرحمن خان شروانی: ایک جائزہ، دیکھیے: **الایام**، کراچی (جنوری-جون ۲۰۱۴ء)، یہ بتانا بھی ضروری ہے کہ ڈاکٹر اورنگزیب اعظمی نے مجلہ **مجلة الهند** کا ایک تحقیقی اور ضخیم شبلی نمبر نکالا ہے جو ۳۸۷ صفحات پر مشتمل ہے اس نمبر میں خاکسار کا مقالہ "العلامة شبلي النعماني و مساهمته في تطوير الدراسات العربية" کے عنوان سے ہے۔ دیکھیے: **مجلة الهند**، بولفور بنغال الغربية، (نومبر-دسمبر ۲۰۱۴ء)، ۳۱۱-۳۲۶۔

نالوا من الذل ما لا ناله أحد
إذ لايرى فيهم علم و لا عمل

ہماری قوم کو وہ ذلت حاصل ہے جو کسی کو حاصل نہیں ہوئی تھی، کیوں کہ اس میں نہ علم نظر آتا ہے نہ عمل۔

ولا تزال ترى ينشتّ شملُهم
في كل يوم وقد ضاقت بهم حيل

ان کا شیرازہ برابر بکھر رہا ہے اور ان کے لیے تمام راستے بند ہو گئے ہیں۔

لا يرغبون إلى ماكان ينفعهم
فجلّ صنعتهم للغيّ والخطل

مفید چیزوں کی طرف ان کا میلان بھی نہیں ہے، ان کا تمام تر کارنامہ گم راہی اور پریشان رائی ہے۔

تراهم اليوم في كأب وفي قلق
فلا أفاد فتيلا مابه اشتغلوا

آج تم ان کو رنج و غم میں مبتلا دیکھ رہے ہو ان کے مشاغل نے ان کو ذرہ بھر بھی فائدہ نہیں پہنچایا۔

لا ينتهون وقد ذاقوا وبالهم
عن سوء صنع فقد باؤا بماعملوا

باوجودے کہ اپنی بداعمالیوں کا مزہ چکھ چکے، لیکن ان سے باز نہیں آتے؛ نتیجہ یہ ہوا کہ اپنے اعمال کا خمیازہ اٹھا رہے ہیں۔

وهل يجازيهم إلا بما اكتسبوا
من كان من عنده الأحكام تنفصل

خدا جو معاملات کا فیصلہ کرتا ہے اس کے سوا ان کو اور کوئی معاوضہ دے سکتا تھا۔

فمن سعی الیوم في إصلاح حالهم
فالله جازیه یوم یقطع الأمل

پس جس شخص نے ان کی اصلاح کے لیے کوشش کی، خدا اس کو قیامت میں صلہ دے گا۔

إن کنت تسئلني من هذه صفته
قلت الإمام الهمام السید البطل

اگر تم مجھ سے پوچھو کہ وہ کون ہے؟ تو میں کہوں گا، امام سردار، بہادر، سید۔

هو الذي فاق في الآفاق منزلة
ونال مالم تنله الأعصر الأُوَل

وہ وہ ہے کہ تمام ملک میں بلند رتبہ ہوا، اور وہ بات حاصل کی جو قدما کو بھی حاصل نہیں ہوئی تھی۔

من أقبل الدین والدنیا علیه معا
والآن في نجح ما قد رام مشتغل

جس کو ایک ساتھ دین و دنیا دونوں ملے اور اب تک اپنے مقاصد کی کام یابی میں مشغول ہے۔

نال المکارم من آبائه و مشی
في المکرمات علی آثار مافعلوا

اپنے آباواجداد سے فضائل حاصل کیے اور اس شاہ راہ میں ان کے نقش قدم پر چلا۔

فجده سيد الأعراب و العجم

قد قال يا أمتي لما دنا الأجل

اس کے دادا عرب و عجم کے سردار تھے اور ان کی موت کا وقت آیا تو صرف امتی کا لفظ ان کی زبان سے نکلا۔

وهكذا صُنع هذا السيد العلم

يقول يا لهف قومي يسيئ ماعملوا

اسی طرح اس نام ور سید نے کہا کہ افسوس میری قوم نے جو کچھ کیا، برا کیا۔

يا خير من سيط حب القوم من دمه

أحسن ولا تبتئس من سوء ما عملوا

اے ان لوگوں میں بہتر جن کے خون میں قوم کی محبت پیوست ہو گئی ہے، عمدہ کام کر اور جو برائیاں قوم نے کیں ان سے غم زدہ نہ ہو۔

أحسن إليهم ولو جازوك سيئة

ولا تبال بما قالوا وما فعلوا

ان کے ساتھ احسان کر، گو وہ تیرے ساتھ برائی کریں اور جو کچھ وہ کہیں اور جو کچھ کریں اس کی پروا نہ کر۔[۳۰]

❁❁❁❁❁❁

۳۰۔ سب سے پہلے علامہ کا یہ قصیدہ علی گڑھ گزٹ (مورخہ ۱۵/اکتوبر ۱۸۸۱ء) میں شائع ہوا، وہیں سے حیات شبلی میں نقل کیا گیا ۔ دیکھیے: سلیمان ندوی، حیات شبلی، ۱۲۲–۱۲۳۔